ہوئی کہ ان لوگوں میں سے کسی کی نگاہ مجھ پر نہیں پڑی۔ وہ نکلے ہوئے چلے گئے۔ میں ایک گلی میں ہو رہی۔ تھوڑی دور جا کے ایک پتلی سی گلی ملی۔ اسی گلی میں ایک مسجد تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ سب سے بہتر خدا کا گھر ہے، تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہیئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، میں درانا اندر چلی گئی۔ یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے۔ سر منڈا ہوا تھا۔ ایک نیلی تہمد باندھے دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں، بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں جا کے چپکے صحن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے "کیوں بی صاحب! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟"

میں:۔ میں مسافر ہوں، خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے تکے تھے مگر میری لگاوٹ کی نظر اور دل فریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا، ہکا بکا ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دام میں آ گئے۔

مولوی:۔ (تھوڑی دیر کے بعد بہت سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں:۔ جی کہیں سے آنا ہوا، مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی:۔ (بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں:۔ جی نہیں، بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی:۔ لاحول ولا قوۃ!

میں:۔ اوئی مولوی صاحب! مجھے تو آپ کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی:۔ جی ہاں، تو میں اکیلا تو رہتا ہوں، اسی لئے تو میں نے کہا مسجد میں آپ کا کیا کام ہے۔

میں:۔ یہ کیا..... خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہتے ہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا۔ مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں، یہ خوب کہی! آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی:۔ میں لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں:۔ میں آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی:۔ لاحول ولا قوۃ۔

میں:۔ لاحول ولا قوۃ؟ یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں۔ یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پڑا ہے؟

مولوی:۔ شیطان آدمی کا دشمن ہے، اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیئے۔

kitaabiyat.pk

میں:۔ خدا سے ڈرنا چاہیے، موئے شیطان سے کیا ڈرنا۔ اور یہ کیا آپ نے کہا آپ آدمی ہیں؟

مولوی:۔ (ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہیں؟

میں:۔ مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں۔ اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں۔ آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا؟

مولوی:۔ پھر کیا کریں، ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے۔

میں:۔ اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے۔ وہ آپ نے نہیں سنا۔

تنہا منشیں کہ نیم دیوانگی است

مولوی:۔ اجی وہ کچھ سہی۔ جس حال میں ہم ہیں خوش ہیں، آپ اپنا مطلب کہیے؟

میں:۔ مطلب تو کتاب کے دیکھنے سے حل ہو گا، بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی:۔ چہ خوش!

میں:۔ چرا باشد۔

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی، مگر اس وقت بھوک کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

رسوا:۔ یہ مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی؟

امراؤ:۔ اے ہے اس کا حال نہ پوچھو۔ بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

رسوا:۔ جی ہاں، جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلاتی ہے، چپت لگانے کو جی چاہتا ہے۔

امراؤ:۔ بس یہی سمجھ لیجیے۔

رسوا:۔ اچھا تو وہ مولوی صاحب میں ایسی کون سی بات تھی جس سے مذاق کرنے کو جی چاہتا تھا؟

امراؤ:۔ کیا کہوں، کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جوان آدمی تھے، صورت بھی کچھ بری نہ تھی۔ سانولی رنگت تھی، چہرے پر حونق پن تھا۔ سر پر لمبے لمبے بال تھے، منہ پر داڑھی تھی، مگر کچھ بے تکے پن کی حد سے بڑھی ہوئی۔ مونچھوں کا بالکل صفایا تھا۔ تہمد بہت اونچی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی تھی جو سر کی پوری چوحدی ڈھانکے ہوئے

تھی۔ بات کرنے کا عجیب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھلتا تھا، پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجیب انداز سے اوپر کو چڑھ جاتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی نکہ دار داڑھی کچھ عجب انداز سے ہل جاتی تھی۔ اس کے بعد ناک سے کچھ ہونہہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں، اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ احتیاطاً منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔

رسوا:۔ کیا واقعی کچھ کھا رہے تھے؟

امراؤ:۔ جی نہیں، جگالی کر رہے تھے۔

رسوا:۔ اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں جسے دیکھ کے بے وقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور عقل مندوں کو ہنسی آتی ہے۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔

امراؤ:۔ اور سنیئے۔ آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا، وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر لیا کرتے تھے۔

رسوا:۔ یہ تو عین تمیز داری ہے، اس لئے کہ عندالتقریر آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہو گا۔

امراؤ:۔ کچھ اور بھی عرض کروں؟

رسوا:۔ بس اب معاف کیجئے، یہاں تو صبح ہو گئی۔

امراؤ:۔ القصہ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا۔

مولوی:۔ (یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے، جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا اور منہ سے) "اس کی کیا ضرورت تھی۔"

میں:۔ (مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی، اس لئے کہ مجھے بھوک لگی ہے، کسی سے کچھ کھانے کو منگا دیجئے؟

مولوی:۔ (اب جھینپے تو یوں باتیں بنانے لگے) میں سمجھا۔ (میں نے دل میں کہا سمجھے کیا خاک۔ سمجھتے تو پتھر کے ہو جاتے) اسی لئے تو کہتا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی۔ کیا کھانا یہاں ممکن نہیں ہے؟

میں:۔ امکان بالقوہ یا بالفعل، بالذات یا بالغیر؟

مولوی:۔ بالفعل تو ممکن نہیں۔ میرا ایک شاگرد کھانا لاتا ہو گا، آپ بھی کھا لیجئے گا۔

میں:۔ بالفعل تو ممکن نہیں، بالذات کی آپ کو توفیق نہیں، اور یہاں ضرورت نے اکل

میت کو جواز کا حکم دے دیا ہے، لہذا بازار سے کچھ لا دیجئے۔

مولوی:۔ اب ذرا صبر کیجئے۔ کھانا آتا ہی ہو گا۔

میں:۔ اب صبر کرنا تکلیف مالایطاق ہے۔ اور دوسرے میں نے بالتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد میں معتکف رہتے ہیں۔

مولوی:۔ اس وقت تو فی نفس الامر میں کچھ نہیں ہے مگر میرا ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہو گا۔

میں:۔ اور بفرض والتسلیم لو کان حالا اگر کھانا آیا بھی تو وہ آپ کی قوت لایموت کے لئے بھی کافی نہ ہو گا، میری شرکت اس میں یعنی چہ؟ اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد من الموت کا مضمون ہے۔ تا تریاق از عراق آوردہ شود.....۔

مولوی:۔ آہا، آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

میں:۔ مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

مولوی:۔ واقعی ایسا ہی ہے، مگر.....۔

میں:۔ (بات کاٹ کر) مگر اس لئے کہ یہاں تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور آپ لاطائل تقریریں کر رہے ہیں۔

مولوی:۔ اچھا تو میں ابھی لایا۔

میں:۔ للہ ذرا جلدی لائیے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربا لا کے میرے سامنے رکھ دیا۔ دیکھ کے جان جل گئی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب اپنے دل میں کچھ اور ہی سمجھے۔

مولوی:۔ (فوراً ساڑھے چودہ گنڈے پیسے، کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادر کے کونے سے کھول کر سامنے رکھ دیئے) سنئے صاحب! چار پیسے کی روٹیاں ہیں، پیسے کا سالن ہے، دھیلا بھانج (روپے کا خوردہ) میں گیا، آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے۔ پہلے گن لیجئے تو کھا لیجئے گا۔

میں نے پھر ایک دفعہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی مگر بھوک بری بلا ہے، جلدی جلدی نوالے اٹھانا شروع کئے۔ جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔

میں:۔ میں نے کہا مولوی صاحب! کیا اس اجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے؟

مولوی:۔ تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دکان ہے جہاں پلاؤ زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے؟

میں:۔ حلوائی کی دوکان تو ہو گی؟

مولوی:۔ حلوائی کی دکان یہ مسجد کے نیچے ہے۔

میں:۔ تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لے کے کیا آئے۔ موئے کتوں کا راتب۔

مولوی:۔ ایسا تو نہ کہیئے۔ آدمی کھاتے ہیں۔

میں:۔ آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی خمیری روٹیاں اور نیلا نیلا شوربا!

مولوی:۔ نیلا تو نہیں ہے۔ اچھا تو دہی لا دوں؟

میں:۔ جی نہیں رہنے دیجئے، معاف کیجئے۔

مولوی:۔ پیسے کا خیال نہ کیجئے، میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں۔

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب مسجد سے باہر چلے گئے۔ اور ایک آب خورے میں خدا جانے کب کا سڑا ہوا کھٹا دہی اٹھا لائے اور اس طرح سامنے لا کے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی قبر پر لات مار دی۔

بہر طور میں نے وہ چار روٹیاں اگل نگل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور دہی یوں ہی چھوڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پیسے کوڑیاں بھی وہیں پڑے رہنے دیئے۔

میں ہاتھ دھونے کو اٹھی تھی، مولوی صاحب سمجھے مسجد سے دفان ہوتی ہے۔

مولوی:۔ اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجئے۔

میں:۔ میری طرف سے مسجد میں چراغی چڑھا دیجئے۔

منہ ہاتھ دھو کے اپنی جگہ پر آ بیٹھی، مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔

کان پور میں مولوی صاحب کی ذات سے مجھے بہت آرام ملا۔ انہی کی معرفت ایک کمرا کرائے پر لیا۔ نوازی پلنگ، دری، چاندنی، چھت، پردے، تانبے کے برتن اور سب ضروریات کا سامان خرید لیا۔ ایک ماما کھانے پکانے کو اور ایک اوپر کے کام کاج کو، دو اور خدمت گار نوکر رکھ لئے، ٹھاٹھ سے رہنے لگی۔ اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔ یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا باج، پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ

کا ایک طبلیہ مل گیا۔ یہ خلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب پرگت ملی۔ اسی کی معرفت دو سارنگئے کان پور کے ذرا سمجھ دار تھے، بلوائے۔ طائفہ درست ہو گیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے تک کمرے پر گانے بجانے کا چرچا رہنے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آدمی آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کم بخت ہو گا جو کسی جلسے میں جانا نہ ہوتا ہو۔ مجرے کثرت سے آتے تھے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہت سا روپیہ کما لیا۔ اگرچہ کان پور کے لوگوں کا راہ رویہ بول چال مجھے پسند نہ تھی، بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا، مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزا ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر خانم کی نوچی بن کے رہنا پڑے گا، کیوں کہ اس پیشے میں رہ کر لکھنؤ میں خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں خانم کا دباؤ مانتی تھیں۔ اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہیں ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا بہم پہنچنا دشوار تھا۔ ناچ مجرے کا ڈھچر کیوں کر چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوئی تھی وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار اچھے گانے والیوں میں تھا، مگر لکھنؤ میں اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے برے کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے، عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اکثر اونچے ہی کمروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کان پور میں میرے حوصلے سے زیادہ میری قدر دانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے ہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی، جس میں میرا بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں۔ استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سینکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا ہو گا۔ ایک دن کا تذکرہ سنئے۔ ایک صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعر و شاعری کا کچھ چرچا نکلا۔ چھوٹتے ہی انہوں نے پوچھا "آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں؟" میں نے کہا "نہیں۔ کون حضرت شارق"؟ یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے، فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب:۔ میں تو سنتا تھا، آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں؟

میں:۔ جی ہاں غریب خانہ تو لکھنؤ ہی میں ہے۔

وہ صاحب:۔ بھلا کہیں ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ لکھنؤ میں ہوں اور حضرت استاد کو نہ جانیں۔

میں:۔ لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا ہے، جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استادوں کا تو ذکر

ہی کیا ہے، ان کے نام بر آوردہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہو گا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو۔ ان کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ یہ تخلص تو میں نے کبھی سنا نہیں۔

وہ صاحب:۔ (چیں بہ جبیں ہو کے) نام لینے سے کیا فائدہ! تخلص شرق سے غرب اور شمال سے جنوب تک زبان زد خلائق ہیں۔ ہاں اک آپ نہیں جانتیں، نہ جانیں!

میں:۔ حضور معاف کیجئے گا، میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلی ہے۔ مگر آپ کے استاد ہیں، آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیئے۔ اچھا تو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو، نام سے واقف ہوں۔

وہ صاحب:۔ میر ہاشم علی صاحب شارق۔

میں:۔ اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں۔ (اتنا کہہ کے اب میں فکر کرنے میں لگی۔ یا الٰہی یہ کون میر ہاشم علی صاحب ہیں۔ آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا) آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟

وہ صاحب:۔ جی ہاں، مرثیہ خوانی میں بھی ان کا مثل و نظیر نہیں۔

میں:۔ بجا ارشاد ہوا، یعنی میر صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔

وہ صاحب:۔ انہی صاحبوں کے ہمسر ہیں۔

میں:۔ بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟

وہ صاحب:۔ کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے، خود تصنیف فرماتے ہیں۔ ابھی ستائیسویں رجب کو نیا مرثیہ پڑھا تھا، تمام شہر میں شہرہ ہے۔

میں:۔ مطلع تو آپ کو یاد ہو گا؟

وہ صاحب:۔ مطلع تو نہیں، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا، وہ مجھے کیا تمام شہر کی زبان پر ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔

میں:۔ ذرا ارشاد کیجئے گا، میں بھی مستفید ہوں۔

وہ صاحب:۔ نکلی غلاف نور سے تفسیر جوہری۔

میں:۔ سبحان اللہ! اس بند کے تو دور دور شہرے ہیں۔ پانچ مصرعے مجھ سے سن لیجئے، واقعی کیا کلام ہے!

وہ صاحب:۔ (بہت ہی خوش ہو کے) جی ہاں، آپ نے یہ مرثیہ لکھنؤ میں سنا ہو گا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنؤ کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا شوق، حضرت شارق کو نہ جانتی ہوں۔

تعجب ہے۔ اب میں سمجھا یہ مذاق تھا۔

میرے جی میں آیا کہہ دوں کہ آپ کے استاد مر کے بھی جئیں گے تو ایسا بند نہیں کہہ سکتے۔ مرزا دبیر (مرحوم) کا کلام ہے، مگر پھر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسوا۔ واقعی آپ نے بڑی عقل مندی کی، ورنہ بے چارے کی روزی میں خلل آتا۔ میر ہاشم علی صاحب شارق پر کیا موقوف ہے، اکثر صاحبوں کا یہی شعار ہے۔ دوسروں کا کلام باہر جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا کے لے گئے، حیدر آباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی، مگر سمجھنے والے سمجھ گئے۔ لکھنؤ سے خطوط آئے۔ اصل مصنف سے تذکرہ ہوا۔ وہ ہنس کے چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھنؤ کو ایسا بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تخلص کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گزر گئی، خود لکھنؤ میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آکر رہے، بلئے اچھے خاصے لکھنوی بن گئے۔ اگرچہ یہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ سے کیا فائدہ۔

امراؤ۔ جی ہاں، اکثر صاحب اسی طرح لکھنؤ فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں۔ کانپور میں میرا بھی ٹھیک یہی حال تھا۔ اس زمانے میں ریل تو تھی نہیں اور نہ لکھنؤ سے کوئی باہر جاتا تھا، بلکہ ہر شہر کے کاملین تلاش معیشت میں یہیں آتے تھے، اپنے کمال کی حسب حیثیت داد پاتے تھے۔ دہلی اجڑ کے لکھنؤ آباد ہوا تھا۔

رسوا۔ فی زمانہ یہی حال دکن کا بھی ہے۔ لکھنؤ اجڑ کے دکن آباد ہوا ہے۔ میں تو گیا نہیں، مگر سنا ہے کہ محلے کے محلے لکھنؤ والوں سے آباد ہیں۔

امراؤ۔ جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہئے پہلے اپنی زبان کی موچ نکالیں۔

رسوا۔ کیا خوب بات کہی ہے! واقعی روزمرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے، مگر لہجہ نہیں آتا۔

(2)

اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں، اور پھر کب کے بچھڑے ہوئے؟ وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنئے۔ کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔ گرمیوں کے دن ہیں، کوئی دو بجے کا وقت ہوگا، میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں۔ ماما باورچی خانے میں خراٹے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں خشک ہو گئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آکر پوچھا "لکھنؤ سے جو رنڈی آئی ہے اس کا کمرا یہی ہے؟" درگا بنئے (جس کی دکان نیچے تھی) نے جواب دیا، "ہاں یہی ہے۔" پھر دریافت کیا، "دروازہ کہاں ہے؟" اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن، گوری سی، منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا گالا، کمر جھکی ہوئی، سفید ململ کا دوپٹہ، تن زیب کا کرتا، نین سکھ کا پائجامہ بڑے بڑے پانچوں کا پہنے، ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے، انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں، ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ایک کالا سا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا۔ وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی:۔ لکھنؤ سے تمہی آئی ہو؟

میں:۔ جی ہاں۔

اتنا کہہ کے میں پلنگ سے نیچے اتر آئی، پان دان آگے کھسکایا، آدمی کو حقے کے لئے آواز دی۔

بڑی بی:۔ ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے۔ زنانہ جلسہ ہوگا۔ تمہارا مجرا کیا ہے؟

میں:۔ بیگم صاحب مجھ کو کیا جانیں؟

بڑی بی:۔ اے تمام شہر میں تمہارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمہارے بلانے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحب خود بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں:۔ اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں؟

بڑی بی:۔ تم نے کیوں کر جانا؟

میں:۔ کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے۔

بڑی بی:۔ ہاں، میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا مجرا تو بتاؤ، ابھی بہت کام پڑا ہے۔

میں:۔ مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں، پچاس روپے لیتی ہوں۔ مگر بیگم صاحب لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انہوں نے قدر کر کے بلایا ہے، تو ان سے کچھ نہ لوں گی۔ جلسہ کب ہے؟

بڑی بی:۔ آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کھچڑی کا تو لو۔ باقی وہاں آ کے سمجھ لینا۔

میں:۔ (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہ تھی، مگر اس خیال سے کہ بیگم صاحب برا نہ مانیں روپیہ لئے لیتی ہوں۔ اچھا اب کہئے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی:۔ مکان تو ذرا دور ہے۔ نواب گنج میں ہے یہ لڑکا سر شام آئے گا، اسی کے ساتھ چلی آنا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمہارے ملنے والوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو۔

میں:۔ اور سازندے؟

بڑی بی:۔ سازندے، خدمت گار، ان کی مناہی نہیں ہے، کوئی اور نہ ہو۔

میں:۔ جی نہیں، یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی، خاطر جمع رکھئے۔

اتنے میں خدمت گار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے لے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھہ چونا لگا کے، ڈلیوں کا چورا ڈبیا میں پڑا ہوا تھا۔ ایک چٹکی اس کی اور الائچی کے دانے پان دان کے ڈھکنوں پر کچل کے گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی:۔ ہائے بیٹا! دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔

میں:۔ آپ کھائیے تو، میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔

بڑی بی سمجھ گئیں۔ پان لے کے کھایا، بہت ہی خوش ہوئیں۔ "ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری!" اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئیں رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں۔ "ذرا دن سے آ جانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔"

میں۔ اگرچہ مجرے کا یہ دستور نہیں ہے، مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی وطن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کانپور میں سینکڑوں جگہ مجرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے، خدا خدا کر کے اتنا دن کٹا۔ پانچ بجتے بجتے لڑکا آموجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی، سازندوں کو بلوا رکھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتا بتا دیا، میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹے بھر کا راستہ تھا۔ چھ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ، کھجور اور طرح طرح کے خوب صورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جا بجا کھنگروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع و اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے ارد گرد دوب جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکے برجے بنے ہوئے تھے ان میں صاف موتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے۔ پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جو اب پانی پہنچا تھا، کیسے تر و تازہ اور شاداب تھے۔

سالگرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شیام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سننے والا نہ تھا، آپ ہی آپ گایا کی، پھر چپ ہو رہی۔ بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپے انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی، چاند نکل آیا، چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے ایک کنارے پر بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے ناندے نہایت خوب صورتی سے سجے ہوئے تھے، اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترا تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوادار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں پانی نہر سے آ کے گرتا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔

واقعی عجیب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں کی مہک۔ ایسی فضا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا، مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی راہ سے بیگم صاحب تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئی تھیں۔ چبوترے پر دو سبز مردنگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لئے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دیئے۔ سازندوں سے کہا تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ، وہیں کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہو گا۔ جب وہ لوگ اٹھ گئے، بیگم صاحب برآمد ہوئیں میں تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مجھ کو قریب بلایا، خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ گانے کے لئے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی۔

حیرانی نگاہ تماشا کرے کوئی
صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین ہو گیا۔ پری میرے سامنے گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے۔ چوٹی کمر تک پڑی ہوئی، سرخ و سفید رنگت، اونچا ماتھا، کھنچی ہوئی بھویں، بڑی بڑی آنکھیں، گال جیسے گلاب کی پتیاں، لچھوئی ناک، چھوٹا سا دہانا، پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آسکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور سینے کا ابھرا پن کس قدر خوش نما تھا۔ سینکڑوں عورتیں میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت کبھی نہ دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھلک ملتی تھی۔ مگر کہاں خورشید کہاں وہ! خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا۔ اس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھر کم پن کہاں! دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک نازک چھریرا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہر اداسی برستی تھی، جب دیکھو بردگن بنی تھی۔ بیگم صاحب بہت خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بہ خود ہنسے دیتی ہیں مگر کسی کو مجال کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انہی میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ ایسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔

لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین بسنتی دوپٹا کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کیچلی کا شلوکا پھنسا پھنسا، سرخ گرنٹ کا پائجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھوں میں موتیوں کی سمرنیں، بازوؤں پر تو رتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں۔ چہرے کی خوب صورتی، لباس کی سادگی، اور زیور کی مناسبت، یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقش حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی۔ میں اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے، وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے، مگر یقین ہی کیجئے گا، ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی، مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں۔ میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک مہری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی ہے، دو سامنے کھڑی ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کی ڈبیا، دوسری کے پاس خاص دان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحب نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انہوں نے سلسلہ کلام اس طرح شروع کیا۔

بیگم:۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں:۔ (ہاتھ باندھ کے) امراؤ۔

بیگم:۔ "خاص لکھنؤ میں مکان ہے۔"

(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا، خصوصاً اس موقع پر، اس لئے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے، آخر بہت سوچ سمجھ کے)

میں:۔ جی ہاں، پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔

جواب دینے کو تو دے دیا، مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر وہی دقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا، اس لئے کہ فوراً ہی بیگم صاحب نے پوچھا۔

بیگم:۔ تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے؟

اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا، جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔ آخر اس بات کو ٹال کے۔

میں:۔ حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے؟

بیگم:۔ کبھی لکھنؤ میں تھا، اب تو کانپور ہی وطن ہو گیا۔

میں:۔ میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

بیگم:۔ کیوں؟

میں:۔ (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا۔ کون قصہ بیان کرتا) اب کیا عرض کروں، بیکار سمع خراشی ہو گی۔ حال ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے کہ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم:۔ چلو اچھا ہے، تو ہمارے پاس بھی کبھی کبھی چلی آیا کرو۔

میں:۔ آنا کیسا، میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اول تو آپ کی قدردانی، دوسرے یہ باغ، یہ فضا، ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو؟ خصوصاً مجھ جیسی خفقانی مزاج کی عورت کے لئے تو یہاں کی آب و ہوا اکسیر کا خواص رکھتی ہے۔

بیگم:۔ اے ہے! تمہیں یہ جنگلہ بہت پسند آیا۔ نہ آدمی نہ آدم ذات، ہیہات، خدا کی ذات، شہر سے کوسوں دور۔ چار پیسوں کا سودا منگاؤ تو آدمی صبح کا گیا شام کو آتا ہے۔ چھائیں پھوئیں، شیطان کے کان بہرے، کوئی بیمار ہو تو جب تک حکیم صاحب شہر سے آئیں، یہاں دشمنوں کا خاتمہ ہو جائے۔

میں:۔ حضور اپنی اپنی طبیعت! مجھے تو بہت ہی پسند ہے۔ میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔

بیگم:۔ جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے۔ شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے۔ اور سب باتوں کو جانے دو، جب سے نواب کلکتے گئے ہیں، راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دیئے سپاہی، پاسی، خدمت گار اس وقت بھی دس مرد نوکر ہیں۔ عورتوں کی گنتی نہیں۔ مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں تو دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں، اگر نواب بھی جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔

میں:۔ قصور معاف ہو، آپ کا مزاج وہمی ہے۔ ایسے ایسے وسواس دل میں نہ لایا کیجئے۔ شہر میں جائیے گا تو قدر و عافیت کھلے گی۔ وہ گرمی ہے کہ آدمی پکے جاتے ہیں۔ دوسرے بیماریاں، خدا پناہ میں رکھے!

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کر آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا، ماشاء اللہ گورا گورا، خوبصورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے مینا۔ بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کدا کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ بڑی دیر تک لئے رہی اور پیار کیا کی، پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں:۔ یوں تو شاید نہ بھی آتی، مگر میاں کو دیکھنے تو ضرور ہی آؤں گی۔

بیگم:۔ (مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو، آنا ضرور۔

میں:۔ ضرور ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ بار بار کیوں فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دوبھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی۔ اسی اثنا میں خاصہ والی نے آ کے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا چلو کھانا کھا لو۔

میں:۔ بہت خوب!

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں، میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہریوں کو اشارہ کیا تم یہیں ٹھہرو۔ ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں:۔ واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم:۔ تو کیا کھانا یہیں منگوا لیا جائے؟

میں:۔ جی نہیں! اچھا، کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم:۔ (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوا دیا گیا؟

مہری:۔ (ہاتھ باندھ کے) حضور! دلوا دیا گیا۔

بیگم:۔ اچھا انہیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جاویں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے۔ ایک مہری آگے آگے فانوس لئے جاتی تھی۔ چپکے سے میرے کان میں کہا "مجھ کو تم سے بہت باتیں کرنا ہیں، مگر آج اس کا موقع نہیں۔ کل تو مجھے فرصت نہ ہو گی، پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا"

میں:۔ مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم:۔ اچھا تو آج کچھ نہ کہو۔ چلو کھانا کھا لیں، اس کے بعد تمہارا گانا سنیں گے۔

میں:۔ پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔

kitaabiyat.pk

بیگم:۔ ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے۔ اس پر گانا۔

میں:۔ بہت خوب!

اب ہم کوٹھی کے زینے کے پاس پہنچ گئے تھے۔ بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طرح سلیقے سے سجی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا، اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گزرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا۔ ہر کمرے کا فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔ آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دستر خوان چنا ہوا تھا۔ دستر خوان پر دو عورتیں اور منتظر تھیں۔ ان میں سے ایک چٹھی نویس تھی، ایک مصاحب۔ ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔

دستر خوان پر کئی قسم کے پلاؤ، بریانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقر خانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، دہی، بالائی غرض کہ ہمہ قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔ بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلایا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا، ہاتھ منہ دھو کے سب نے پان کھائے۔ پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسے میں صرف بیگم صاحب ہی نہ تھیں۔ چٹھی نویس، مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں، مامائیں، سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحب نے حکم دیا کہ طبلے کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب، جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی، طبلہ بجانے لگی، خود بیگم صاحب ستار چھیڑنے لگیں، مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھاتے گیارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ، جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے، عجب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالی شان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی کا عالم تھا۔ مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں

چونک کر ایک ہانک بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چڑیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا بے تکا راگ گا رہے تھے۔ جھینگر آس دے رہے تھے۔ سوائے اس چبوترے کے، جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں، اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے۔ صرف دو مردنگوں کی روشنی تھی، ان کے بھی شیشے سبز۔ تاروں کا عکس تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بھیانک سروں نے دلوں پر اپنا اثر کیا تھا۔ سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی، اور جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر، خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا، بیشک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس اثنا میں گیدڑوں کے بولنے کی آواز آئی، اس نے اور بھی دلوں کو دہلا دیا، اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم صاحب نے گاؤ تکئے سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں۔ اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں، میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحب کو میں سمجھ چکی تھی کہ وہمی ہیں، مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈانٹے باندھے، ننگی تلواریں ہاتھ میں، دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر، خدمت گار، پاسی سب اسی طرف کو چلے۔ کوئی نہتا، کسی کے ہاتھ میں لاٹھی۔ مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے۔ کئی تو راستے ہی سے فرار ہو گئے، چار پانچ آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے۔ انہوں نے عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا، سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں، خدا جانے کیا پتھر دل تھا کہ بیٹھی رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یا اللہ! دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے۔ وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی

ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز:۔ (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو، ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کا عندیہ معلوم کر لینے دو۔ (ڈاکوؤں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو:۔ جس ارادے سے آئے ہیں، تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز:۔ وہی میں پوچھتا ہوں، جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو:۔ ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی باپ دارے کا بیر ہے؟ ہاں جس ارادے سے آئے ہیں اس میں تم مزاحم ہو گئے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز:۔ (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لو گے؟ اگر یہ مقصد ہو..... (سرفراز پوری بات بھی کرنے نہ پایا تھا کہ کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا)

کوئی ڈاکو:۔ نا صاحب! کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ۔ کیا ہمارے بہو بیٹیاں نہیں ہیں؟ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے؟

سرفراز:۔ (خوش ہو کے) تو پھر یہی میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو، ہم ابھی تمہیں کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں، اور جو عورتیں وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک بیگم یہیں ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ، جو جی چاہے اٹھا لے جاؤ۔ رہا عورتوں کا زیور وہ بھی ہم اتروائے دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔ خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ بینک گھر میں جمع ہے۔ علاقے سے جو آتا ہے اس کا ذکر نہیں۔

ڈاکو:۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ مگر اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز:۔ سپاہی کے پوت دغا نہیں کرتے، خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جس کی آواز میں نے پہچانی تھی، آگے بڑھا۔

ڈاکو:۔ واہ کیا کہنا! مردوں کا قول ہی تو ہے۔ اچھا تو کنجیاں؟

اتنا کہنا تھا کہ میری اس کی نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے پہچان تو لیا، بولنے کا قصد کیا، مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا "بھابی! تم یہاں کہاں؟"

میں:۔ جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے۔ یہیں ہوں۔

فضل علی:۔ یہاں کس کے پاس؟

میں:۔ رہتی تو شہر میں ہوں لیکن یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں، ان سے ملنے آئی تھی۔

فضل علی:۔ تمہاری بہن کہاں ہیں؟

میں:۔ یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا بے چاری غش میں پڑی ہیں۔ میری طرح تو ہیں نہیں، بیچاری پردہ نشیں ہیں؟

فضل علی:۔ پردہ نشیں ہیں؟

میں:۔ جوانی میں رانڈ ہوئیں، جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی:۔ (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسے کی چیز لینا میرے نزدیک تو حرام ہے اور نہ میں اس معاملے میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو:۔ یہ کیا، پھر آئے کیوں تھے۔؟

فضل علی:۔ جس ارادے سے آئے، تمہیں معلوم ہے، مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں، یا جس سرکار سے ان لوگوں کا توسل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا!

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا، مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے، کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔ پھر بھی خالی ہاتھ پھر جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے "فاقوں مرتے ہیں، کریں تو کیا کریں۔ ایک موقع ملا بھی تو اسے خان صاحب چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں۔"

جب فضل علی اپنے گروہ سے نکل کے الگ کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور شخص سیاہ فام سایہ کہتا ہوا نکلا۔

وہ شخص:۔ کھان صاحب، میں بھی تمرے ساتھ ہوں۔

غور سے جو دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیس ہے۔ میں نے اسے بلایا۔ علیحدہ لے جا کے باتیں کیں۔ وہ اشرفی اور روپے جو بیگم صاحب نے انعام دیئے تھے، چپکے سے اسے دے دیئے۔

فضل علی:۔ (سرفراز خان سے) بھائی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز:۔ میں ان لوگوں کو بھی راضی کئے دیتا ہوں۔ مگر یہاں سے چلو۔ عورتیں پریشان ہو رہی ہیں۔ ذرا ان کو ہوش میں آنے دو۔ ہم تم لوگوں کو خوش کریں گے۔ ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحب ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ دانت بیٹھ گئے تھے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی، ان کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا "سنبھل کے بیٹھئے، خدا کے صدقے سے وہ آفت ٹل گئی۔ خاطر جمع رکھئے۔" اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کر اٹھایا۔ سب اٹھ کے بیٹھیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحب بہت خوش ہوئیں۔ سرفراز خان کو بلا بھیجا۔

سرفراز:۔ سرکار کچھ دے دیجئے، بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نہ امراؤ جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی۔

بیگم:۔ کسی نہ کسی وقت کی محبت کام آ ہی جاتی ہے۔

میں نے اس بات کا جواب نہ دیا، اس لئے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت گھبراہٹ میں یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقع پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے۔

میں:۔ جی نہیں۔ میں نے کیا کیا۔ یہ بھی اتفاق تھا۔

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا۔ پانچ سو نقد اور پانچ پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انہیں ٹالا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم:۔ کیوں امراؤ جان! باغ میں رہنے کا مزا دیکھا؟

میں:۔ حضور سچ کہتی تھیں۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے، سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لئے بچھوا دیا گیا۔ نیند کسے آتی۔ رات بھر جاگ رہی۔ صبح ہوتے سب سو گئے۔ میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی نیند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آ گئے۔ مجھے جگوایا، میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمت گار:۔ آپ تو خوب یہاں آئیں، رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے۔

میں:۔ کیوں کر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمت گار:۔ اچھا تو اب چلئے۔ لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔